کرامت انسانی کے موانع و مشکلات کا تجزیہ

مؤلف: ڈاکٹر صمد بہروز و عبداللہ نصری
مترجم: مولانا جعفر زیدی

تمام الٰہی مخلوقات میں صرف انسان ہی ایسی مخلوق ہے جسے تاج کرامت عطا ہوا ہے: وَلَقَد کَرَّمنَا بَنی آدَمَ وَ حَمَلنَاهُم فِی البَرِّ وَ البَحرِ وَ رَزَقناهُم مِنَ الطَّیِباتِ وَ فَضَّلناهُم عَلی کَثیرٍ مِمّن خَلَقنا تَفضیلاً[۱] ۔یہ کرامت، برتری، امتیاز، صلاحیت اور استعداد ذاتی اور بالقوہ طور پر انسان کے وجود میں پائی جاتی ہے اور انسان کا فریضہ یہ ہے کہ ان صلاحیتوں کو ابھارے اور انہیں شکوفا کرے۔ تکوینی کرامت انسان کے لئے موقع فراہم کرتی ہے تاکہ انسان اپنی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو شکوفا کرکے کمال کے اعلی درجہ پر فائز ہوسکے اور یہ وہی کسبی کرامت ہے جو انسان اپنے ارادہ اور اختیار سے حاصل کرتا ہے۔

انسانی کرامت کی راہ میں بہت سے موانع، آفتیں اور مشکلات پائی جاتی ہیں جن میں سے بعض کا تعلق خود انسان کے عمل سے ہے تو بعض کا تعلق شناخت و معرفت سے۔ پیش نظر مقالہ میں نہج البلاغہ کی روشنی میں ہم ان موانع کو جاننے کی کوشش کریں گے جن کا تعلق معرفت و شناخت سے ہے اور اسی طرح سے اس بات کو روشن کریں گے کہ اگر انسان کو انسان اور دنیا کی صحیح معرفت نہ ہو تو انسانی کرامت خدشہ دار ہوتی ہے۔

انسانی کرامت کے سلسلہ میں بہت سے مقالات لکھے جاچکے ہیں لیکن جس چیز کا بہت کم تذکرہ ہوا ہے وہ انسانی کرامت کی راہ میں پائی جانے والی رکاوٹیں اور مشکلات ہیں جو انسان کو اس کے اعلی مقصد تک پہنچنے سے روک دیتے ہیں اور ان صلاحیتوں کو شکوفا نہیں ہونے دیتے ہیں جس کے ذریعہ انسان کرامات کی اعلی منزلوں کو طے کرسکتا ہے۔

۱۔ سورہ اسراء، آیت ۷۰

اس مقالہ میں ہم نہج البلاغہ میں موجود امام علیؑ کے نورانی فرامین و ارشادات کی روشنی میں یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ انسان اور دنیا کی صحیح معرفت نہ ہونے اور انسانی کرامت کے مخدوش ہونے میں گہرا رابطہ پایا جاتا ہے۔ نہج البلاغہ کی روشنی میں اگر انسان کو عالم ہستی میں اپنے مقام و رتبہ کی صحیح معرفت نہ ہو تو وہ انسانی کرامت کے اعلی رتبہ سے گرنے لگتا ہے اور جو صلاحیتیں پروردگار نے اس کے اندر ودیعت کی ہیں وہ کبھی بھی شکوفا نہیں ہونگی۔

کرامت کی تعریف:

کرامت مادہ کرم سے لیا گیا ہے۔ صاحب کرامت انسان یعنی نیک اخلاق اور پسندیدہ صفات انسان[۱]۔ کتاب التحقیق فی کلمات القرآن کے مصنف کرامت کے اصلی معنی عزت اور فوقیت بیان کرتے ہیں جس کے مقابل میں ذلت و خواری ہے۔[۲]

کرامت کی نسبت کبھی پروردگار کی جانب دی گئی ہے اقرا و ربك الاکرم[۳] ، کبھی فرشتوں کی جانب کراما کاتبین[۴] اور کبھی انسان کی جانب و لقد کرمنا بنی آدم[۵]۔

انسانی کرامت:

انسانی کرامت ایک خاص قسم کی کرامت ہے جو صرف اور صرف انسان سے مخصوص ہے اور دوسری مخلوقات اس سے بے بہرہ ہیں۔ ایسی کرامت جو قدرتی و طبیعی کرامت اور ملکوتی و الٰہی کرامت دونوں کو جمع کئے ہوئے ہے۔ استاد جوادی آملی کا ماننا ہے کہ صرف انسان ہی ملک و ملکوت کو صحیح و سالم طریقہ سے جمع کر سکتا ہے اور پوری طرح سے مکرم بن سکتا ہے۔ آپ کے نزدیک چونکہ فرشتوں اور جنات میں یہ دو طرح کی کرامت نہیں پائی جاتی ہے لہذا سزاوار ہے کہ وہ انسان مکرم کے آگے سجدہ ریز ہوں۔[۶]

۱۔ ابن منظور، مکرم، لسان العرب، مادہ کرم؛ راغب اصفہانی، حسین بن محمد، المفردات فی غریب القرآن، مادہ کرم

۲۔ مصطفوی، حسن، التحقیق فی کلمات القرآن، مادہ کرم

۳۔ سورہ علق، آیت ۳

۴۔ سورہ انفطار، آیت ۱۱

۵۔ سورہ اسراء، آیت ۷۰

۶۔ جوادی آملی، عبداللہ، صورت و سیرت انسان در قرآن، ص ۳۲۸

۱۔ **تکوینی کرامت**: وہ فضیلتیں، صلاحیتیں اور استعداد جس کو انسان کی تخلیق کے وقت اس کی ذات اور فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے، حقیقت میں اس کرامت کا خالق خود ذات باری تعالی ہے: و لقد کرمنا بنی آدم و حملناهم فی البر و البحر و رزقناهم من الطیبات و فضلناهم علی کثیر ممن خلقنا تفضیلاً[۱]۔ پروردگار نے یہ صلاحیتیں انسان کے وجود میں قرار دی ہیں اور انسان صرف ان صلاحیتوں کو لینے والا ہے اور اگر کوئی اس کرامت کے سلسلہ میں لائق ستایش و تمجید ہے تو خود ذات پروردگار ہے، نہ کہ انسان ۔فتبارك الله احسن الخالقین[۲]۔

یہ کرامت عمومی ہے یہاں تک کہ غیر مومن کو بھی شامل ہے۔علامہ طباطبائی کے مطابق یہ کرامت حتی مشرک وکافر و فاسق و فاجر کے اندر بھی پائی جاتی ہے۔[۳]

۲۔ **اکتسابی کرامت**: یہ وہ کرامت ہے جسے انسان اپنی محنت و سعی و کوشش سے حاصل کرتا ہے؛ یہی وجہ ہے کہ صرف یہی کرامت قابل تحسین و صد آفرین ہے۔ البتہ اس کرامت تک پہنچنے کی راہ تکوینی کرامت سے ہو کر گذرتی ہے۔ اگر انسان کے وجود اور ذات میں یہ صلاحیت نہ ہوتی تو وہ کبھی بھی اکتسابی کرامت تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ یہ کرامت، ایمان و تقوا کا قرین و لازمہ ہے اور جتنا شخص ایمان و تقوا والا ہوگا اتنا ہی وہ اکتسابی کرامت کے درجات کو بھی حاصل کر سکتا ہے۔ ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم[۴]۔

بعض محققین صرف اکتسابی کرامت ہی کو معیار تعظیم و تکریم انسان جانتے ہیں اور اگر یہ نہ ہو تو وہ انسانی کرامت کے قائل نہیں ہیں۔[۵] اور جو اس اکتسابی کرامت سے محروم ہیں وہ آیۂ کالانعام بل هم اضل[۶] اور شیاطین الانس و الجن[۷] کے مصداق ہیں اور خطاب کرمنا ان کے لئے نہیں ہے[۸]۔

۱۔ سورہ اسراء، آیت ۱۴

۲۔ سورہ مومنون، آیت ۱۴

۳۔ طباطبائی، محمد حسین، المیزان فی تفسیر القرآن، ج ۱۳، ص ۱۵۵

۴۔ سورہ حجرات، آیت ۱۳

۵۔ صورت و سیرت انسان در قرآن، ص ۳۲۸-۳۳۲

۶۔ سورہ اعراف، آیت ۱۷۹

۷۔ سورہ انعام، آیت ۱۱۲

۸۔ جوادی آملی، امام خمینیؒ و کرامت انسانی، ص ۴-۷

بعض عرفا اکتسابی کرامت سے محروم افراد کو حیوان ناطق کے دائرہ میں رکھتے ہیں اور انسان سے ان افراد کو وہی نسبت ہے جو مردہ بدن کو انسان سے ہے کہ جن کی صرف صورت اور شکل ہی انسانوں کی طرح ہے[۱]۔ امام خمینیؒ بھی انسانوں کو بالقوہ اور بالفعل انسانوں میں تقسیم کرتے ہیں اور آپ کا ماننا ہے کہ تمام انبیاء کے آنے کا مقصد یہی تھا کہ وہ انسان بالقوہ کو انسان بالفعل کر دیں۔[۲]

مذکورہ باتوں سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ صرف اس صورت میں انسان قابل تکریم و تعظیم ہے جب وہ اکتسابی کرامت کو حاصل کرتا ہے ورنہ وہ کرامت سے بالکل بے بہرہ ہے۔

انسان کو انسان کی صحیح شناخت و معرفت نہ ہونا

۱۔ انسان شناسی کی اہمیت و ضرورت:

پوری تاریخ بشریت میں خدا شناسی اور معرفت پروردگار کے بعد اگر کسی مسئلہ نے فلاسفہ، ماہرین نفسیات اور ماہرین سماجیات کی فکر کو اپنی جانب کھینچا ہے تو وہ ہے انسان کی شناخت اور اس کے وجودی پہلو کے اسرار و رموز سے واقف ہونا۔ آج تک بہت سی تحقیقات اس ناشناختہ و پر اسرار موجود کو پہچاننے کے سلسلہ میں انجام دی گئی ہیں لیکن آج بھی اس کے وجود کے کچھ ایسے پہلو ہیں جنھیں کشف ہونا باقی ہے اور جو آج بھی سوالات و ابہامات کی اتھاہ تاریکی میں غوطہ زن ہیں۔ بعض محققین اور صاحبان نظر اس سلسلہ میں ایک طرح کی ذہنی کشمکش سے دوچار ہیں۔

الکسیس کارل کا ماننا ہے کہ انسان کی اندرونی دنیا کا ایک وسیع حصہ ابھی کشف نہیں ہوا ہے اور انسانی زندگی پر مطالعہ کرنے والے زیادہ تر افراد کے سوالات ابھی بھی بے جواب ہیں۔[۳]

بشر کی یہ عاجزی و ناتوانی اس وجہ سے ہے کہ انسان اس پورے عالم کا نچوڑ ہے اور تمام عالم کا ماحصل انسان کی ذات ہے۔ استاد جوادی آملی کی تعبیر کے مطابق انسان عالم مجرد و عالم مادہ دونوں کو اپنے اندر جمع کئے ہوئے ہے[۴]۔ یہی وجہ ہے علامہ جعفری ہر انسان کو ایک قارہ مانتے ہیں جسے مستقل طور پر کشف کرنے

۱۔ ابن عربی، محی الدین، فتوحات المکیہ، ج ۲، ص ۴۴۱۔۴۶۸

۲۔ امام خمینی، شرح چہل حدیث، ص ۲۱۸

۳۔ کارل، الکسیس، انسان موجود ناشناختہ، ص ۴، ۶

۴۔ جوادی آملی، تفسیر موضوعی قرآن، ج ۱۵، ص ۱۶۸

اور اس پر تحقیق کی ضرورت ہے[۱]۔اسی وجہ سے انسان پر ہونے والی صدیوں کی تحقیقات و مطالعات کے باوجود اس کی ذات کے بہت سے ایسے پہلو ہیں جو ظاہر نہیں ہوئے ہیں اور علم انسان شناسی جس طریقہ سے ترقی کر رہا ہے اس سلسلہ میں اس کے سوالات و ابہامات و مجہولات میں بھی اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ملا صدرا کے مطابق انسان ایک لا انتہا موجود کا نام ہے جس کا کوئی معین مقام و رتبہ نہیں ہے اور دوسرے تمام ممکنات کے برخلاف اس کی کوئی خاص شناخت اور ثابت وجودی رتبہ نہیں ہے اور معرفت حقائق کی چابی نفس انسانی کی معرفت ہے۔[۲]

اب تک جو کچھ بیان کیا گیا اس کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ انسان کا خود کو نہ پہچاننا یا غلط پہچاننا کسی بھی دوسری چیز سے زیادہ اس کے حق میں نقصان دہ ثابت ہوا ہے۔ ممکن ہے انسان مختلف علوم و فنون پر کمند ڈال دے مگر وہ اپنی حقیقی و واقعی شناخت و معرفت سے عاجز ہے؛ وہ دنیا تو کھوج سکتا ہے لیکن خود اس کی ذات اس کے لئے مبہم و مجہول ہے۔ دنیا کو کھوج نکالنا اپنی ذات کے حقائق سے جاہل رہ کر انسان کی مشکل کو حل نہیں کر سکتا ہے۔امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام اس شخص پر تعجب کرتے ہیں جو اپنی گمشدہ چیز کے تو پیچھے ہے لیکن اپنی گمشدہ ذات سے بالکل غافل ہے[۳]۔ آپ کی نظر میں وہ انسان جو نفس واحد کے حساب و کتاب سے عاجز و ناتوان ہے وہ دوسروں کے بھی حساب و کتاب سے جو کہ بہت زیادہ ہیں، عاجز و ناتوان رہیگا[۴]۔ جب تک انسان کو اپنی صحیح معرفت نہیں ہوگی، عالم خلقت میں وہ اپنی منزلت کو نہیں سمجھ پائے گا۔ وہ اپنے درد کو نہیں پہچان پائے گا اور جب درد کو نہیں جانے گا تو لا محالہ اس کے علاج سے بھی عاجز رہے گا۔

۲۔ صحیح انسانی شناخت کے عملی اثرات:

صحیح انسانی شناخت کے عملی اثرات مندرجہ ذیل ہیں:

۱. عالمی حادثات کے سلسلہ میں انسانی سوچ اور اس کے رویہ پر اثر انداز ہوتا ہے۔

۲. اپنی خوبیوں اور خامیوں سے بخوبی آشنائی جس کے نتیجہ میں انسان کی خود سے توقع معتدل رہتی ہے۔

۱۔ جعفری، محمد تقی، ترجمہ و تفسیر نہج البلاغہ، ج۱۹، ص ۱۶۳

۲۔ صدر الدین شیرازی، محمد بن ابراہیم، الحکمۃ المتعالیہ فی الاسفار الاربعۃ العقلیہ، ج۸، ص ۳۴۳

۳۔ تمیمی آمدی، عبدالواحد، غرر الحکم و درر الکلم، ص ۲۳۳

۴۔ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، ج۲۰، ص ۳۳۱

۳. شناخت و معرفت خدا کا مقدمہ ہے۔
۴. خود کی تعمیر کا موقع فراہم ہوتا ہے[۱]؛ جیسا کہ الکسیس کارل کے نزدیک تعمیر نفس کا عملی فائدہ یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو دوبارہ زندہ اور اس کی از سر نو تعمیر و اصلاح کرتا ہے۔[۲]
۵. انسان "مجازی خودی" کو "حقیقی خودی" تصور نہیں کرتا اور خود سے بیگانہ نہیں ہوتا۔
۶. انسان اپنی صلاحیتوں، توانائیوں اور بلند و بالا مقاصد کو کشف کرکے انھیں شکوفا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔
۷. انسان کی خود کی صحیح معرفت کا معنی یہ ہے کہ رشد، ترقی انسانی کمال اور کرامت انسانی کے حاصل کرنے کی راہ میں جو رکاوٹیں ہیں، انسان اسے صحیح طریقہ سے پہچانے اور اپنے اور دوسروں کے وجود سے ان موانع کو برطرف کرے۔
۸. زندگی کو ایک مقصد حاصل ہوتا ہے، لغو، بے فائدہ اور خالی پن سے انسانی زندگی کو نجات ملتی ہے۔
۹. دوسرے انسانوں کے انسانی حقوق اور خاص کر ان کے حق کرامت پر خاص توجہ رہتی ہے اور ان کے حقوق پامال نہیں ہوتے۔
۱۰. انسان کی صحیح شناخت، یعنی خلقت کے اصلی مقصد سے آشنا ہونا؛ جب انسان اس نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے کہ تمام عالم ہستی اپنی تمام تر بزرگی و عظمت کے باوجود انسان کے لئے مقدمہ کی حیثیت رکھتی ہے، اس وقت وہ اپنے وجود کی عظمت و قیمت کو جان پائے گا اور اپنے مقام و منزلت کو بہتر درک کر پائے گا۔

جب انسان خود اور اپنی خلقت کے اصلی مقصد کو جان لیگا اور نظام خلقت میں اپنے صحیح مقام و رتبہ کو کشف کر لے گا، تو اس کے بعد دنیا اور اس کی رنگینیاں اسے خود سے غافل نہیں کر پائیں گی بلکہ وہ انسانیت کے بلند و بالا مقصد تک پہنچنے کے لئے اپنی تمام سعی و کوشش کرے گا، لا تشغلهم عنها زينة متاع ولا قرة عين من ولد ولا مال[۳]۔ دنیا کے زرق و برق ایسے انسانوں کی آنکھوں کو چوندھیاتی نہیں ہیں اور اس

۱۔ شرفی، محمد رضا، جوان و بحران ہویت، ص ۳۳
۲۔ انسان موجود ناشناختہ، ص ۳۰۵
۳۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۱۹۹

کے تجملات اسے فریب نہیں دے پاتے ہیں؛ جیسا کہ امام علیؑ کی تعبیر کے مطابق بعض لوگ دنیا کی رنگینیوں پر فریفتہ ہو چکے ہیں: ولکنهم حلیت الدنیا فی اعینهم و راقهم زبرجها[۱]۔

اگر انسان خود کو اور جس دنیا میں زندگی گزار رہا ہے اسے پہچان لے تو کبھی بھی اس کا بیٹا نہیں کہلائے گا: فکونوا من ابناء الآخرة ولاتکونوا من ابناء الدنیا[۲] اور اپنی اخرت کو برباد کرکے اپنی دنیا کو آباد نہیں کرے گا؛ جیسا کہ بعض دنیا پرست لوگ اس مصیبت میں گرفتار ہیں: تعمر دنیاك بخراب آخرتك"۔[۳]

۳۔ نظام تخلیق میں انسان کا اپنی منزلت و رتبہ سے ناآشنا ہونا اور اس کے تباہ کن اثرات

اگر نظام تخلیق میں انسان اپنے مقام و منزلت کو نہیں پہچانے گا تو انسانی کرامت کے پیکر پر شدید و کاری ضرب لگے گی جس کی وجہ سے انسان مقام احسن تقویم سے گر کر اسفل سافلین تک پہنچ جائے گا۔ انسان کا اپنے وجود سے جاہل ہونا سبب ہوتا ہے کہ انسان اپنے وجود کی ذات و ماہیت سے پوری طرح بیگانہ ہو جائے اور کسی دوسری چیز کو "خودی" تصور کرے (خود سے بیگانگی)۔ مثال کے طور پر اپنے وجود کے کئی پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو کو وہ پورا وجود تصور کرے اور دوسرے پہلوؤں سے غافل ہو جائے، یا انسان کو صرف مادی مخلوق مانے، یا اس کی تمام توجہ اپنے جسم اور نفس کی خواہشوں اور ضرورتوں کو پورا کرنے میں ہو اور اپنے وجود کے روحانی اور الٰہی پہلو سے غافل ہو۔ ایسا انسان ممکن ہے ایک عمر تک کسی ایسے وجود کی پرورش کرتا آئے جس سے وہ پوری طرح انجان ہو۔ امیر المومنین حضرت علیؑ کی نگاہ میں نظام تخلیق میں انسان کا اپنے مقام و رتبہ کو پہچاننا اسے ہلاکت سے بچاتا ہے: ما هلک من عرف قدره[۴]۔

۱۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۳
۲۔ ایضاً، خط ۴۲
۳۔ ایضاً، خط ۷۱
۴۔ غرر الحکم و درر الکلم، ص ۲۳۳

ایک دوسری روایت کے مطابق آپؑ کی نظر میں جو انسان خود سے جاہل ہو بھلے ہی وہ تمام دنیاوی علوم کا ماہر و جاننے والا کیوں نہ ہو در حقیقت وہ جاہل و نادان ہے۔ العالم من عرف قدره و كفى بالمرء جهلا الا يعرف قدره[۱]۔

مولانا روم ایسے انسانوں کی تشبیہ ایسے افراد سے دیتے ہیں جو اعلی قسم کا سامان اور بہترین کاریگروں کے ذریعہ اور بہت محنت و مشقت اور بے پناہ سرمایہ خرچ کرنے کے بعد ایک بہترین مکان تعمیر کرواتا ہے، اس مکان میں کسی بھی چیز کی کمی نہیں ہوتی ہے۔ ہر لحاظ اور ہر جہت سے وہ مکان بہترین ہوتا ہے لیکن جس دن وہ اس مکان میں رہنے کا ارادہ کرتا ہے اسی دن اسے معلوم پڑتا ہے کہ جس زمین پر اس نے یہ مکان تعمیر کروایا ہے یہ زمین کسی اور کی ہے اور خود اس کی زمین اسی طرح سے ویران و بنجر پڑی ہوئی ہے۔

الف: **خود فروشی:** اگر انسان اپنے وجودی مقام و منزلت سے غافل ہو اور اسے نہ جانے تو وہ ہمیشہ اپنے آپ کو حقیر سمجھے گا اور اپنے کو ارزاں فروخت کردے گا۔ امام علیؑ کے نزدیک انسان کی سب سے کم قیمت جنت ہے، اس سے کم میں اگر انسان خود کو بیچنے پر راضی ہو جائے تو یہ گھاٹے کا سودا ہے: انه ليس لانفسكم ثمن الا الجنة فلا تبيعوها الا بها۔[۲]

خود فروشی یعنی خود کو دنیا کے عوض بیچ دینا؛ دنیاوی مقام، دنیاوی شہرت، دنیاوی لذت، دنیاوی شہوت، دنیاوی دولت۔ بیشک یہی خسران مبین ہے: ولبئس المتجر ان ترى الدنيا لنفسك ثمناً ومما لك عند الله عوضا"۔[۳]

بعض انسان اس قدر اپنی شان و منزلت کو گھٹادیتے ہیں کہ اپنے وجود جیسے قیمتی و نایاب گوہر کو کہ یہ عظیم کائنات جس کے لئے صرف ایک مقدمہ ہے، اسے بے ارزش چیز کے عوض بیچ دیتے ہیں۔ امیر المومنینؑ ایسے انسانوں کو سب سے زیادہ احمق قرار دیتے ہیں: من الناس من يبيع نفسه بالدراهم

۱۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۱۰۳
۲۔ ایضاً، حکمت ۴۵۴
۳۔ ایضاً، خطبہ ۳۲

والدنانیر و من الناس من یبیع نفسه باحقر الاشیاء و اهونها وهولاء فی الحقیقة احمق الناس ۔[۱]

آنحضرت انسانوں کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں، پہلے حصہ میں وہ لوگ ہیں جو خود کو دنیا کے بدلے بیچ کر اپنے نفس کی تباہی و بربادی کا سبب بنتے ہیں، دوسرے حصہ میں وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنی قیمت کو جانا اور اپنے آپ کو دنیا کی قید سے آزاد کرالیا : و الناس فیها رجلان رجل باع نفسه فاوبقها و رجل ابتاع نفسه فاعتقها [۲]۔

امام علیؑ کی نظر میں اگر کوئی دنیا اور اس کی بزرگی و عظمت کا دلباختہ ہو تو وہ دنیا کا غلام بن چکا ہے: من عظمت الدنیا فی عینه و کبر موقعها من قلبه آثرها علی الله تعالی فانقطع الیها و صار عبدا لها۔ [۳] جن لوگوں نے اپنے آپ کو دنیا کے عوض بیچا اور اس کی غلامی کا طوق پہن لیا، ان لوگوں نے خود کو بزرگ و عظیم نعمت یعنی آزادی سے محروم کرلیا ہے۔ آپؑ نے انسانوں کو اس طرح کی خرید و فروخت سے سخت منع کیا اور ہر قسم کی قید و بندش سے آزادی، انسان کا فطری حق جانا ہے: لا تکن عبد غیرك و قد جعلك الله حرا۔ [۴] وہی چیز جو تمام انبیاء خاص کر حضرت ختمی مرتبتؐ کی بعثت کا بنیادی مقصد ہے یضع عنهم اصرهم والاغلال التی کانت علیهم۔ [۵]

ب: **لذت پرستی**: نظام تخلیق میں اپنے رتبہ کو نہ پہچاننے کا دوسرا نقصان لذت پرستی ہے جس کی وجہ سے وہ انسانیت کے اعلی مقصد سے غافل ہو جاتا ہے۔ مکتب لذت پرستی کا ماننا ہے کہ انسان ہر چیز اور ہر کام کا انتخاب اپنی لذت کے مطابق کرتا ہے جو اس کی کامیاب زندگی کا آغاز و انجام ہوتا ہے [۶] یعنی انسان صرف دنیاوی لذتوں کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔

۱۔ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، ج ۲۰، ص ۱۷۳
۲۔ نہج البلاغہ، حکمت ۱۳۳
۳۔ ایضاً، خطبہ ۱۶۰
۴۔ ایضاً، خط ۳۱
۵۔ سورہ اعراف، آیت ۱۵۷
۶۔ رہنمائی، سید احمد، درآمدی بر فلسفہ تعلیم و تربیت، ص ۲۰۸

اس مکتب کے مطابق دنیا میں انسان کا مقصد صرف اس کی لذتوں سے بہرہ مند ہونا ہے اور دوسرے انسانی کمالات و فضائل جیسے ایثار، شہامت، درگذر کرنا، سخاوت، بخشش اور کرم کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اس مکتب میں کوئی ایسا نہیں ہے جو دنیاوی لذتوں کو چھوڑ کر انسانیت کی اعلی منزل پر پہنچ جائے؛ صرف وہی افراد اس مکتب کے پیروکار ہیں جن کا ہم و غم دنیاوی لذتوں کو حاصل کرنے اور عیش و عیاشی کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ یہ انسان کا اپنے مقام و منزلت سے ناواقفیت و جہالت ہے کہ اتنی عظیم کائنات اس کے لئے خلق ہوئی ہے۔ کیا یہ صرف اس وجہ سے ہے کہ انسان چار دن یہاں لذتیں حاصل کرے اور اس کے بعد ہر چیز ختم ہو جائے؟! اگر مان بھی لیں کہ انسان لذت کا دیوانہ ہے تو کیوں صرف وقتی اور جلدی ختم ہونے والی لذتوں کے پیچھے ہے؟ کیوں وہ آخرت کی ابدی اور ہمیشہ باقی رہنے والی لذت کا خواہاں نہیں ہے؟!

امیر المومنین امام علیؑ کی نگاہ میں وہ لذت جو عذاب الٰہی اور آتش جہنم کا سبب بنے وہ لذت ہی نہیں ہے؛ حقیقت یہ ہے کہ جنت کی لذتوں کے علاوہ ہر لذت کمتر اور حقیر ہے: ما خیر بخیر بعده النار و ما شر بشر بعده الجنة و کل نعیم دون الجنة فهو محقور و کل بلاء دون النار عافیة"۔[1]

کتنا فاصلہ ہے مکتب لذت پرستی میں جو لذت کے علاوہ کسی اور چیز کا قائل ہی نہیں اور مکتب علوی میں جس کے نزدیک فانی اور جلد ختم ہو جانے والی لذتیں بے معنی و پوچ ہیں، وہ اس لائق نہیں ہیں کہ انسان ان سے دل لگائے: ما لعلی و لنعیم یفنی و لذة لا تبقی[2]۔

ج: **حیوان نما انسان**: بعض انسانوں کی زندگی کسی حیوان سے کم نہیں؛ یعنی زندگی سے انھیں وہی چاہئے ہوتا ہے جو ایک حیوان کو چاہئے۔ وہ انسان جس کی تمام کوشش اور توجہ صرف جسمانی خواہشوں جیسے کھانے اور پینے پر ہو یتمتعون و یاکلون کما تاکل الانعام[3] تو اس کی زندگی ایک حیوانی زندگی سے زیادہ نہیں ہے جو انسانی کرامت و وقار سے میلوں دور ہے۔

۱۔ نہج البلاغہ، حکمت ۳۸۷

۲۔ ایضاً، خطبہ ۲۲۳

۳۔ سورہ محمد، آیت ۱۲

امیر المومنینؑ کے نزدیک انسان کا مرتبہ اس سے سوا ہے کہ وہ حیوانوں کے طرح صرف کھانے کی فکر میں ہو اور اس کے علاوہ کچھ اور نہ سوچے۔ اتمتلی السائمة من رعیها فتبرك و تشبع الربیضة من عشبها فتربض و یاکل علی من زاده فیهجع قرت اذاعینه اذااقتدی بعدالسنین المتطاولة بالبهیمةالهاملة والسائمةالمرعیة۔ کیا جس طرح بکریاں پیٹ بھر لینے کے بعد سینہ کے بل بیٹھ جاتی ہیں اور سیر ہو کر اپنے باڑے میں گھس جاتی ہیں، اسی طرح علی بھی اپنے پاس کا کھانا کھالے اور بس سو جائے۔ اس کی آنکھیں بے نور ہو جائیں اگر وہ زندگی کے طویل سال گزارنے کے بعد کھلے ہوئے چوپاؤں اور چرنے والے جانوروں کی پیروی کرنے لگے۔[۱]

آنحضرتؑ کے نزدیک انسان اس چیز سے کہیں زیادہ بلند و بالا ہے کہ وہ صرف اپنے پیٹ کو بھرنے کی فکر میں رہے اور اعلی انسانی مقاصد سے غافل ہو جائے: فما خلقت لیشغلنی اکل الطیبات کالبهیمة المربوطة همها علفها اوالمرسلة شغلها تقممها تکترش من اعلافها وتلهوعما یراد بها۔ میں اس لئے تو پیدا نہیں ہوا ہوں کہ اچھے اچھے کھانوں کی فکر میں لگا رہوں۔ اس بندھے ہوئے مغلوب جانور کی طرح جسے صرف اپنے چارے ہی کی فکر لگی رہتی ہے یا اس کھلے ہوئے جانور کی طرح جس کا کام منہ مارنا ہوتا ہے، وہ گھاس سے پیٹ بھر لیتا ہے اور جو اس کے ساتھ ہونے والا ہے، اس سے غافل رہتا ہے۔[۲]

امام علیؑ پیغمبرؐ کے فریضہ رسالت کو بیان کرتے ہوئے آپ کو ایک ایسے طبیب سے تشبیہ دیتے ہیں جو گھر گھر جا کر روح کے بیماروں کا معالجہ کرتے ہیں۔ بعض روحانی بیمار جو علم و حکمت سے بے بہرہ ہیں اور صرف طبیعی و مادی زندگی کے خواہاں ہیں وہ چوپایوں کی مانند ہیں: فهم فی ذلك کالانعام السائمة والصخورالقاسیة[۳]۔

ایک دوسرے مقام پر آپ انسانوں کو تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں: خدارسیدہ عالم، راہ نجات پر چلنے والا طالب علم اور عوام الناس کا وہ گروہ جو ہر آواز کے پیچھے چل پڑتا ہے اور ہر ہوا کے ساتھ لہرانے لگتا

۱۔ نہج البلاغہ، خط ۴۵

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً، خطبہ ۱۰۸

ہے۔اس نے نہ نور کی روشنی حاصل کی اور نہ کسی مستحکم ستون کا سہارا لیا ہے۔ تیسرے گروہ کو آپؑ نے چرنے والے حیوان سے تشبیہ کیا ہے: سلس القیاد للشهوة اومغرما بالجمع والادخار اقرب شیء شبها بهما الانعام السائمه۔[۱]

امام خمینیؒ کی نظر میں پیدا ہونے کے بعد انسان، حیوان بالفعل ہوتا ہے جو اپنی شہوت و غضب کو کنٹرول کرتا ہے اور اگر کسی مربی یا معلم کے زیر سایہ تربیت نہ پائے تو عجیب و غریب حیوان میں تبدیل ہو جاتا ہے جو صرف اپنے نفس کی پیروی کرتا ہے اور نیک اخلاق و خصال کا اس میں شائبہ تک نہیں ملے گا؛ بلکہ شمع فطرت الٰہی بھی اس کے وجود میں گل ہو گئی ہو گی اور تمام الٰہی و انسانی اقدار کو نفسانی اڑیل گھوڑے کی سموں تلے پامال کرتا چلا جائے گا اور آخرت میں حیوان یا شیطان کی صورت میں محشور ہوگا۔[۲]

وہ انسان جن کی زندگی کا مقصد جسمانی ضرورتوں اور خواہشوں کو پورا کرنے کے علاوہ کچھ اور نہ ہو اگر وہ ہزاروں سال بھی زندہ رہیں تو ذرہ برابر بھی انسانیت و کرامت کو درک نہیں کر پائیں گے اور جتنا زیادہ زندہ رہیں گے خود کو حیوانیت سے نزدیک کرتے رہیں گے کیونکہ انہوں نے تمام انسانی وجود کو حیوانیت اور حیوانی ضرورتوں کے آئینہ میں دیکھا ہے۔ ایسے افراد امام علیؑ کی نظر میں وہ مردہ ہیں جو زندوں کے درمیان زندگی بسر کر رہے ہیں: وذلك میت الاحیاء[۳]۔ جیسا کہ آپؑ کی نگاہ میں ہر وہ انسان جس کے پاس دل وہ اہل درک و خرد نہیں ہے: و ما کل ذی قلب بلبیب ولا کل ذی سمع بسمیع ولا کل ناظر ببصیر[۴]۔

آپؑ بعض انسانوں کو صرف پرچھائیں مانتے ہیں جو انسانی روح سے خالی ہیں اور ان نابینا افراد کے مانند ہیں جو حقیقت کو دیکھنے سے محروم ہیں: ما لی اراکم اشباحا بلا ارواح و ارواحا بلا اشباح و نساکا بلا صلاح و تجارا بلا ارباح و ایقاظا نوما و شهودا غیبا و ناظرة عمیاء وسامعة صماء و

۱۔ نہج البلاغہ، حکمت ۱۴۷

۲۔ شرح چہل حدیث، ص۱۶۸۔۱۶۹

۳۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۸۷

۴۔ ایضاً، خطبہ ۸۸

ناطقة بكماء[1]۔

اور چونکہ پوری طرح خدا سے انکا رابطہ ٹوٹ چکا ہے لہٰذا ان کا ظاہر تو انسان جیسا ہے لیکن ان کی روح حیوانی ہے۔ فالصورة صورة انسان و القلب قلب حيوان [2]۔ شہید مطہریؒ کی تعبیر کے مطابق روحانی و معنوی اعتبار سے وہ مسخ ہو کر ایسے حیوان میں تبدیل ہو چکے ہیں کہ عالم حیوان میں بھی اس جیسا متعفن و کثیف وجود نہیں پایا جاتا ہے: بل هم اضل [3]۔ آپ کی نظر میں اگر کسی انسان کی اخلاقی و نفسیاتی خصوصیتیں، کسی درندہ کی خصوصیتوں میں بدل جائے تو ایسے انسان کی روح حقیقت میں مسخ ہو کر حیوان کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔[4]

عالم ہستی کی صحیح شناخت و معرفت نہ ہونا:

یہ عالم ہستی جو انسان کے رشد و ترقی و اعلی انسانی کمال تک پہنچنے کا ایک وسیلہ ہے یہ اس صورت میں اپنے فرض پر عمل کر سکتا ہے جب اس کے سلسلہ میں انسان کی سوچ اور نقطہ نظر صحیح ہو اور عالم ہستی کے سلسلہ میں اس کی معرفت حقیقت کے مطابق ہو؛ ورنہ ممکن ہے ترقی کے بجائے اس کی تنزلی و پسماندگی کا زمینہ فراہم ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ عالم ہستی کے سلسلہ میں انسان کا زاویہ نگاہ اور ذہنیت بلند انسانی مقاصد تک پہنچنے میں نہایت موثر ہیں۔ دنیا کے بارے میں انسان کا صحیح تصور اس سے صحیح فائدہ حاصل کرنے اور غلط تصور غلط فائدہ اٹھانے کا سبب بنتا ہے۔ اس حصہ میں ہم نہج البلاغہ کی روشنی میں عالم ہستی کے بارے میں انسان کے غلط تصور کو بیان کریں گے کہ اس دنیا میں اس کی روش زندگی، اس کے افکار و کردار سب اسی غلط تصور کی وجہ سے ہیں۔ اگر انسان خلقت کے بلند مقاصد و انسانی کرامت کے اعلی درجہ تک نہیں پہنچ پاتا ہے تو سب اس دنیا کے سلسلہ میں اس کے غلط تصور کا نتیجہ ہے۔

۱۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۱۰۸

۲۔ ایضاً

۳۔ سورہ اعراف، آیت ۱۷۹

۴۔ مطہری، مرتضی، انسان کامل، ص ۲۴۔۲۵

محض مادی زندگی:

بعض انسان عالم ہستی کو محض مادی زندگی کے زاویہ نگاہ سے دیکھتے ہیں اور صرف مادی زندگی کے خواہاں ہیں اور اس زندگی کے ماورا کسی دوسری زندگی کے بارے میں نہیں سوچتے ہیں۔ظاہر ہے ایسے افراد اپنی پوری طاقت اس مادی زندگی سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے میں صرف کریں گے اور زندگی کے دوسرے پہلو یعنی اس کے معنوی اقدار سے پوری طرح غافل رہیں گے۔ان لوگوں کے اعمال ایسے ہیں گویا اس دنیاکے بعد کوئی اور دنیا نہیں ہے؛ حالانکہ قرآن مجید میں جہاں بھی لفظ دنیا آیا ہے وہاں اسے دنیاوی زندگی کی ایک صفت کے طور پر پیش کیا گیا ہے، جیساکہ الحیاۃ الدنیا، نزدیک زندگی کے معنی میں مذکور ہے۔مذکورہ بالا باتوں سے واضح ہوتا ہے کہ اگر انسان دنیا کو اصلی گھر اور حقیقی ٹھکانہ قرار دے تو یہ دنیا اس کے لئے نہایت خطرناک اور نقصان دہ ثابت ہوگی؛ لیکن اگر وہ خود کو اس دنیا میں ایک مسافر سمجھے تو یہ دنیا اس کے لئے فائدہ مند ہوگی؛ کیونکہ مسافر ہمیشہ اپنے اصلی گھر اور وطن جانے کے بارے میں سوچتا رہتا ہے اور خود کو ہمیشہ واپسی کے لئے تیار و آمادہ رکھتا ہے اور کبھی بھی راستہ کو منزل نہیں بناتا ہے۔انسان کی زیادہ تر مشکلوں کی وجہ یہ ہے کہ وہ دنیا کو ہی اپنا اصلی وطن سمجھتا ہے حالانکہ اگر دنیا کا پڑاو ہونا انسان کے لئے واضح اور روشن ہو تو اتنی خیانتیں، فتنہ و فساد، جنگ و خونریزی دنیا کی خاطر نہ ہوتی۔

انسان کے مادہ پرست اور حقیقت سے گریزاں ہونے کے عوامل:

یہاں بنیادی سوال یہ ہے کہ کیوں بعض انسان مادی زندگی کو اتنی اہمیت دیتے ہیں اور حقیقت سے روگردان ہو کر اپنے اس انتخاب سے انسانی کمالات و فضائل تک پہنچنے سے محروم ہو جاتے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ عصر رنسانس اور علم کی بے نظیر ترقیوں کے بعد انسان اس نتیجہ پر پہنچا کہ علم تمام مشکلات کا حل ہے اور انسان اپنے تمام سوالوں کے جوابات کو تجربہ سے حاصل کر سکتا ہے جس کے نتیجہ میں دھیرے دھیرے وہ دین و وحی اور الٰہی تعلیمات سے دور ہوتا گیا۔

انسان اگر یہ سوچے کہ علمی اور فکری لحاظ سے وہ پوری طرح مستقل ہے اور الٰہی و وحیانی تعلیمات سے بے نیازی کا احساس کرنے لگے تو اس کا انجام اس کے علاوہ کچھ اور نہیں ہو سکتا ہے۔ وحی سے بے نیازی کا احساس اسے سرکش بنا دیتی ہے:

ان الانسان لیطغی ان راٰہ استغنی[1] ۔ آلبر کاموکے نزدیک انسانی حیات کا فلسفہ مذہب ہے جسے لوگ اندیکھا کردیتے ہیں[2]۔ ماکس پلانک کے نزدیک بھی ماہرین علم فیزیک ان افراد کے مانند ہیں جو خطوط و نقوش کو پڑھتے تو ضرور ہیں لیکن ان خطوط کے ماوراجو حقیقت ہے وہ اس سے غافل ہیں[3] ۔یہ دنیا اپنی تمام وسعت کے باوجود خطوط و نقوش کے مانند ہے جس کی تفسیر کو اس کے خالق سے سیکھا جائے۔ رسل انسانوں کی تشبیہ پیدائشی بہرے بچوں سے دیتے ہیں جو کچھ موسیقی دانوں کے درمیان بڑے ہوئے ہیں اور موسیقی کی بعض نوٹ (Note) کو پہچان پاتے ہیں اور ہر نوٹ ان کی ظاہری مشاہدوں سے مربوط ہے لیکن موسیقی کی اہمیت اور کس طرح سے یہ وجود میں آتی ہے ان کے لئے ہرگز قابل درک و فہم نہیں ہے۔ رسل کے نزدیک طبیعت کے سلسلہ میں علم انسان بھی اسی طرح ہے وہ طبیعت کے نوٹس (Notes) کو تو سمجھ لیتا ہے اور اس کے ریاضی و فیزیک رابطوں کو جان لیتا ہے لیکن ان نوٹس کے پیچھے طبیعت کے کون سے اسرار نہفتہ ہیں وہ اسے کبھی نہیں جان پاتا ہے۔[4]

بعض لوگوں کا ماننا ہے کہ وہ لوگ جو مادی و طبیعی زندگی کو انسانی خلقت کا ہدف قرار دیتے ہیں وہ سب سے زیادہ غافل انسان ہیں[5] چونکہ یہ افراد اپنی گمشدہ چیز کو اس خاکی عالم میں تلاش کررہے ہیں جبکہ ان کی گمشدہ چیز کسی دوسرے عالم میں ہے۔ یہ کہ انسان صرف مادی زندگی کے درپئے ہو یا اس مادی زندگی کو وسیلہ بناکر ماورائے طبیعت کی جانب سیر کرے یہ انسان کے عزم وارادہ و حوصلہ اور دوراندیشی پر منحصر ہے۔ بعض لوگوں کی دیکھنے کی قدرت اتنی محدود ہے کہ دنیا کے علاوہ انھیں کچھ اور نظر نہیں آتا ہے لیکن بعض اپنی بصیرت، دوراندیشی اور تیز بینی کی وجہ سے مادی و طبیعی زندگی کو اس عظیم و وسیع کائنات کا ایک چھوٹا اور معمولی جز مانتے ہیں۔

۱۔ سورہ علق، آیات ۶۔۷
۲۔ ترجمہ و تفسیر نہج البلاغہ، ص ۷۷
۳۔ ایضاً، ص ۷۴
۴۔ رسل، برتراند، مفہوم نسبیت انشتین، ص ۲۳۳
۵۔ ترجمہ و تفسیر نہج البلاغہ، ص ۸۵

دنیا کو استقلال کی نظر سے دیکھنا

دنیا کو دیکھنا آئینہ کو دیکھنے کے مانند ہے؛ کبھی انسان خود آئینہ کو استقلالی حیثیت سے دیکھتا ہے۔ اسے آئینہ میں دکھنے والی تصویر سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ ممکن ہے اس نگاہ میں اس کی توجہ آئینہ کی کیفیت، اس کی شفافیت، آئینہ کی بناوٹ و خوبصورتی پر ہو، اسے ابھی اس سے کوئی سروکار نہیں ہے کہ خود اس کی تصویر اس آئینہ میں کیسی دکھ رہی ہے چونکہ استقلالی حیثیت سے آئینہ کو دیکھنا اسے دوسری جانب توجہ کرنے نہیں دے رہی ہے۔ لیکن اگر توجہ آئینہ میں دکھنے والی تصویر کی جانب ہو اس صورت میں خود وہ آئینہ کیسا ہے اس سے غافل ہو جائے گا۔ دنیا کی بھی یہی خصوصیت ہے بعض لوگ دنیا کو استقلالی حیثیت سے دیکھتے ہیں اور ان کی تمام توجہ کا مرکز صرف دنیا ہوتی ہے۔ ایسے افراد دنیا کے وسیلہ ہونے اور خلقت کے بلند و بالا مقصد سے غافل ہو جاتے ہیں۔ بعض ایسے بھی افراد ہوتے ہیں جو دنیا کو بلند و بالا مقصد کے حصول کا وسیلہ سمجھتے ہیں۔

امیر المومنین حضرت علیؑ ایک چھوٹے سے جملے میں دنیا کی حقیقت اور اس کے وسیلہ ہونے کو نہایت خوبصورت انداز میں بیان فرماتے ہیں: و من ابصر بها بصرته و من ابصر اليها اعمته، جو دیدہ عبرت سے دنیا کی جانب دیکھتا ہے تو دنیا اسے حقیقت سے روشناس کراتی ہے اور جو اس کی رنگینیوں میں مدہوش ہو جاتا ہے تو دنیا اسے اندھا کر دیتی ہے[1]۔

میرزا حبیب اللہ خوئی اس جملہ کے سلسلہ میں بیان فرماتے ہیں: جو دنیا کو خود سے آشنا ہونے کے لئے وسیلہ اور آئینہ کے طور پر استعمال کرے اور اعلی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اسے سیڑھی بنائے تو دنیا اسے صاحب بصیرت کر دیتی ہے لیکن جس کی ساری توجہ صرف اور صرف دنیا کا حصول ہو اور دنیا ہی کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالیتا ہے تو دنیا اسے اندھا کر دیتی ہے۔[2]

نہج البلاغہ کے ایک دوسرے فراز میں کس طرح سے دنیا مقصد قرار پاتی ہے اسے آپؑ اس طرح بیان فرماتے ہیں: فان الدنيا مشغلة عن غيرها و لم يصب صاحبها منها شيئا الا فتحت له حرصا عليها و لهجا بها و لن يستغنى صاحبها بما نال فيها عما لم يبلغه منها و من وراء ذلك فراق

۱۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۸۲

۲۔ ہاشمی خوئی، میرزا حبیب اللہ، منہاج البراعہ فی شرح نہج البلاغہ، ج۵، ص۳۴۰

ما جمع و نقض ما ابرم و لو اعتبرت بما مضی حفظت ما بقی۔ دنیاآخرت سے روگرداں کردینے والی ہے اور جب دنیااور اس سے کچھ تھوڑا بہت پالیتا ہے تو وہ اس کے لئے اپنی حرص و شیفتگی کے دروازہ کھول دیتی ہے اور یہ نہیں ہوتا کہ اب جتنی دولت مل گئی اس پر اکتفا کرے اور جو ہاتھ نہیں آیا اس سے بے نیاز رہے۔ حالانکہ نتیجہ میں جو کچھ جمع کیا ہے اس سے جدائی اور جو کچھ بندوبست کیا ہے اس کی شکست لازمی ہے اور اگر تم گذشتہ حالات سے عبرت حاصل کرو تو باقی عمر کی حفاظت کرسکوگے۔[1]

شہید مطہریؒ ہر اس چیز کو جو انسان کو جکڑ کر محو کردے اسے انسانی شخصیت کے خلاف جانتے ہیں جو اسکے جمود کا سبب ہے۔ دنیاکے ساتھ انسان کا رابطہ اگر وابستگی اور وارفتگی کا ہو تو تمام انسانی اقدار نابود و فنا ہو جائیں گے۔[2]

لہٰذا اگر دنیااور اس کی تمام تر رعنائیاں اس طریقہ سے ہوں کہ انسان کو خود میں مشغول کردے اور انسانی خلقت کے اعلی مقصد یعنی انسانی کرامت تک پہونچنے میں اس کی راہ کی رکاوٹ بنے اور اسے مقصد کے طور پر دیکھا جائے تو ایسی دنیا نہ صرف یہ کہ انسان کی ترقی کا سبب نہیں ہوگی بلکہ یہ انسان کے لئے مضر اور نقصان دہ بھی ہے۔ لیکن اگر انسانی کرامت کے مرتبہ تک پہونچنے کے لئے اسے وسیلہ اور زینہ کے طور پر دیکھا جائے تو یہ دنیا پسندیدہ و مطلوب ہے۔ پھر اس دنیا میں گزارا ایک ایک لمحہ انسان کو اس کے عالی مقصد سے نزدیک کرتا جاتا ہے۔

نہج البلاغہ میں ایسی دنیا کی مذمت نہیں ہوئی ہے بلکہ اس دنیا کو سراہا گیا ہے۔ حضرت علیؑ نے جب سنا کہ ایک شخص دنیا کو نہایت برا بھلا بول رہا ہے تو آپ نے غصہ کے عالم میں اس سے فرمایا: ان الدنیا دار صدق لمن صدقها و دار عافیة لمن فهم عنها و دار غنی لمن تزود منها و دار موعظة لمن اتعظ بها مسجد احباءالله ومصلی ملائکةالله ومهبط وحیاالله ومتجراولیاءالله اکتسبوا فیهاالرحمة وربحوا فیها الجنة۔ بلا شبہ دنیااس شخص کے لئے سچائی کا گھر ہے جو اس کا یقین کرے، اور جو اس کی ان باتوں کو سمجھے اس کے لئے امن و عافیت کی منزل ہے اور جو اس سے زاد راہ حاصل کرے، اس

۱۔ نہج البلاغہ، خط ۴۹

۲۔ مطہری، مرتضی، سیری در نہج البلاغہ، ج ۳، ص ۲۶۴

کے لئے دولتمندی کی منزل ہے اور جو اس سے نصیحت حاصل کرے اس کے لئے وعظ و نصیحت کا محل ہے۔ وہ دوستان خدا کے لئے عبادت کی جگہ، اللہ کے فرشتوں کے لئے نماز پڑھنے کا مقام وحی الٰہی کی منزل اور اولیاء اللہ کی تجارت گاہ ہے۔ انھوں نے اس میں فضل و رحمت کا سودا کیا اور اس میں رہتے ہوئے جنت کو فائدہ میں حاصل کیا۔[۱]

دنیا کو بد بختی کا ذریعہ سمجھنا

بعض فلاسفہ دنیا کی سیاہ و تاریک تصویر کھینچتے ہیں۔ درد و رنج و بد بختی کے علاوہ جس کا کوئی نتیجہ نہیں ہے۔ ان کے نزدیک دنیا جہنم کے مانند ہے جس میں انسان قید ہیں اور فرار کی ساری راہیں مسدود ہیں۔ ابو العلاء معری (۳۸۴۔۴۴۹، ۹۹۴۔۱۰۵۷) دنیا کو سراسر رنج و زحمت، ناکامی و بد بختی کا سرچشمہ جانتے ہیں جس میں وقت گذارنے کے علاوہ کوئی دوسرا چارہ نہیں ہے[۲]۔ ایسی دنیا جس میں زندگی گزارنا ایک مہلک بیماری اور ٹھہرنا عذاب ہے[۳]۔ ان کے نزدیک نسل کو آگے بڑھانا ناقابل معافی گناہ ہے۔ وہ ہمیشہ دوسروں کو یہ نصیحت کرتے تھے کہ بانجھ عورتوں کے علاوہ کسی دوسری عورت سے شادی نہ کریں، ان کے نزدیک بہترین عورت، بانجھ عورت ہے[۴]۔ یہی وجہ ہے انھوں نے تادم مرگ شادی نہیں کی اور اس بات پر انھیں ذرہ برابر بھی افسوس نہیں تھا۔ وہ کہتے تھے کہ میں نے اپنی اولاد سے نعمت عدم کو نہیں چھینا جو کہ دنیاوی نعمت پر برتری رکھتی ہے؛ چونکہ اگر وہ اس دنیا میں آتے تو انھیں رنج و بد بختی کے علاوہ کچھ اور نہیں ملتا۔[۵] ان کے نزدیک وہ ماں باپ مجرم ہیں جنھوں نے اولاد کو جنم دے کر اپنی اولاد کے حق میں ظلم کیا ہے، بھلے ہی وہ اولاد آگے چل کر امیر یا توانا خطیب بن جائے۔[۶]

۱۔ نہج البلاغہ، حکمت ۱۳۱

۲۔ فروخ، عمر، عقائد فلسفی ابو العلاء فیلسوف معرہ، ص ۵۸ و ۲۲۴

۳۔ ایضاً، ص ۱۱۳، ۱۳۳، ۱۳۹ و ۲۴۸

۴۔ عقائد فلسفی ابو العلاء فیلسوف معرہ، ص ۲۰۵۔۲۰۴

۵۔ ایضاً، ص ۲۲۸

۶۔ ایضاً، ص ۲۲۲

شوپنھاور بھی دنیا میں زندگی گزارنے کو سب سے بڑی بد بختی جانتے ہیں جس کا ازالہ خود کشی کرنے سے بھی نہیں ہوگا۔ شوپنھاور کے نزدیک تنہا ایک حقیقت موجود ہے اور وہ درد و رنج والم ہے[۱]۔ دنیا ایک ایسا جہنم ہے جو دانتہ کے جہنم سے بدتر ہے اور زندگی وہ گناہ ہے جس کا کفارہ صرف موت کی تکلیف کو برداشت کرکے ہو سکتا ہے۔[۲]

دنیا کو دیکھنے کے حوالہ سے انسانوں میں فرق

انسانوں میں جو فرق پایا جاتا ہے وہ اس بات پر منحصر ہے کہ دنیا کے بارے میں ان کا نظریہ کیا ہے۔ دنیا کے سلسلہ میں جو بد گمان ہے یہ اس وجہ سے ہے کہ دنیا کی غلط تصویر اس کے ذہن میں ہے۔ اگر اس تصویر کو صحیح کر دیا جائے تو تمام مصیبتوں، سختیوں، مشکلات، ناکامیوں اور درد و رنج والم کے باوجود اسے دنیا خوبصورت و حکیمانہ لگے گی: الذی احسن کل شیء خلقہ[۳] جیسا کہ حضرت یوسف نے قید خانہ کو تمام سختیوں، مشکلات اور شکنجوں کے باوجود پسندیدہ بتلایا: رَبِّ السِّجنُ اَحَبُّ اِلی مِمّا یَدعُونَنی اِلَیہ[۴] اور حضرت زینب سلام اللہ علیہا کربلا کے تمام مصائب و آلام کو خوبصورت بتلاتی ہیں[۵]۔ دنیا کی صحیح معرفت اور اس کے فلسفہ اور حکمت سے آشنائی اس کی تمام مشکلات اور سختیوں اور پریشانیوں کو خوبصورت بنا دیتی ہیں۔

ابو العلاء معری اور شوپنہاور جیسے لوگ جنھوں نے دنیا سے بد گمانی اور مایوسی کے نظریہ کو فروغ دیا ہے ان افراد کا اصلی درد یہ ہے کہ انھیں دنیا کی صحیح شناخت و معرفت نہیں ہو سکی ہے؛ کیونکہ اگر وہ فلسفۂ تخلیق سے آشنا ہو جاتے تو اس طرح دنیا کے مصائب و آلام کا مرثیہ نہ پڑھتے۔ اگر وہ یہ جان جاتے کہ انسان کے کمال تک پہنچنے کا راستہ دنیا کی مشکلات اور سختیوں سے ہو کر گذرتا ہے[۶] اور دنیا آرام و عیش و عشرت کی

۱۔ توماس، هنری و توماس دانالی، ماجراهای جاودان در فلسفه، ص ۳۲۰۔۳۱۸

۲۔ ایضاً، ص ۲۷۸

۳۔ سورہ سجدہ، آیت ۷

۴۔ سورہ یوسف، آیت ۳۳

۵۔ مجلسی، محمد باقر، بحار الانوار، ج ۱۴، ص ۱۱۵

۶۔ لقد خلقنا الانسان فی کبد (سورہ بلد، آیت ۴)

جگہ نہیں ہے تو وہ کبھی بھی دنیا کی مشکلات اور پریشانیوں کو دیکھ کر گھبراتے نہیں۔ اگر وہ فلسفۂ خلقت انسان اور کمال و ترقی کی منزل کو طے کرنے کے لئے انسان کا امتحان سے گزرنے اور مشکلات و سختیوں میں مبتلا ہونے کی ضرورت سے واقف ہوتے تو وہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے اس فرمان کو بھی درک کر پاتے اور بے جا شکوہ نہ کرتے:

و لکن اللہ یختبر عبادہ بانواع الشدائد و یتعبدھم بانواع المجاھد و یبتلیھم بضروب المکارہ اخراجا للتکبر من قلوبھم و اسکانا للتذلل فی نفوسھم و لیجعل ذلک ابوابا فتحا الی فضلہ و اسبابا ذللا لعفوہ؛

ترجمہ: لیکن اللہ سبحانہ، اپنے بندوں کو گوناگوں سختیوں سے آزماتا ہے اور ان سے ایسی عبادت کا خواہاں ہے جو طرح طرح کی مشقتوں سے بجالائی گئی ہو اور انھیں قسم قسم کی ناگواریوں سے جانچتا ہے تاکہ ان کے نفوس میں عجز و فروتنی کو جگہ دے اور یہ کہ اس ابتلا و آزمائش سے اپنے فضل و امتنان کے کھلے ہوئے دروازوں تک انھیں پہنچائے اور اسے اپنی معافی و بخشش کا آسان وسیلہ و ذریعہ قرار دے۔[۲]

کوتاہ فکری و تنگ نظری سب سے بڑا المیہ

بعض انسانوں کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ دنیا کے سلسلہ میں تنگ نظری اور کوتاہ فکری کا شکار ہیں جس کا نتیجہ کھوکھلا پن اور بے مقصد زندگی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے؛ جیسا کہ پروفیسر یونگ بیان کرتے ہیں کہ پوری دنیا سے جتنے بھی مریض میرے پاس آتے ہیں ان میں سے دو تہائی وہ افراد ہیں جو پڑھے لکھے اور کامیاب لوگ ہیں لیکن خالی پن اور بے مقصد زندگی کے درد میں مبتلا ہیں۔[۳]

اگر دنیا اور اس میں رہنے والے افراد کو انسان مثبت نظر سے نہ دیکھے تو وہ اسی نتیجہ پر پہنچے گا کہ دنیا ایک قید خانہ ہے اور اس میں رہنے والے تمام افراد معمولی سے بازیچہ سے بڑھ کر نہیں ہیں[۴]۔ اگر انسان اس

۱۔ دار بالبلاء محفوفة و بالغدر معروفة لا تدوم احوالها و لا یسلم نزالها احوال مختلفة و تارات متصرفة العیش فیها مذموم، نہج البلاغہ، خطبہ ۲۲۶

۲۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۱۹۰

۳۔ نصری، عبداللہ، فلسفہ آفرینش، ص۱۹۸

۴۔ ایضاً، ص۱۷۵ اور ۱۸۰

عالم کے نظام کو حکمت سے خالی جانے تو ایسا انسان اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ شہید مطہری کے بقول وہ خود کو دنیا سے پوری طرح انجان پاتا ہے جس کا اس دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہے اور وہ یہاں ایک قیدی کی مانند ہے جس کی پوری کوشش قید خانہ سے فرار ہونے کی ہوتی ہے۔[۱]

ہر طرح کی مشکلات، سختیاں، ظلم و جنگ وجنایت و بربریت کے باوجود اگر کچھ لوگ اس دنیا کی منصفانہ حکمتوں کو نہیں سمجھ سکے ہیں تو یہ ان کی فکر اور فہم کی کوتاہی ہے۔ کسی چیز کا نہ ملنا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ وہ چیز موجود نہیں ہے۔ اگر ہم نابینا یا کم بینا ہیں تو یہ دلیل نہیں ہے کہ حقیقت بھی موجود نہیں ہے۔ بعض ایسے انسان ہوتے ہیں جن کے کانوں تک حق کی آواز نہیں پہنچتی ہے: وقر سمع لم یفقه الواعیة وکیف یراعی النباة من اصمته الصیحه[۲]۔ حقیقت میں یہ لوگ آنکھوں والے اندھے اور کانوں والے بہرے ہیں: ناظرة عمیاء وسامعة صماء[۳]۔

کوتاہ فکر فلاسفہ اور ان کے پیروں کاروں کی سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ انھوں نے دنیا کے صرف ایک رخ کو دیکھ کر پوری ہستی کے سلسلہ میں فیصلہ سنا دیا! انھیں عالم ہستی کی حکمت، نظام اور عدل و انصاف پر اعتراض ہے حالانکہ عالم ہستی کا ایک وسیع حصہ یعنی عالم آخرت کو انھوں نے ابھی درک بھی نہیں کیا ہے۔ یقینا اگر ان کی چشم بصیرت وا ہوتی اور وہ عالم مادہ سے ماورا کی حقیقتوں کو درک کر پاتے تو وہ ان اہل ذکر کے مانند ہوتے جن کی توصیف میں امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ وہ یہ شکوہ نہیں کرتے پھرتے ہیں کہ دنیا میں کوئی حکمت نہیں ہے:

فکانما قطعوا الدنیا الی الآخرة وهم فیها فشاهدوا ما وراء ذلك فکانما اطلعوا غیوب اهل البرزخ فی طول الاقامة فیه وحققت القیامة علیهم عداتها فکشفوا غطاء ذلك لاهل الدنیا حتی کانهم یرون مالا یری الناس ویسمعون مالا یسمعون۔

ترجمہ: گویا انھوں نے دنیا میں ہوتے ہوئے آخرت تک منزل کو طے کر لیا اور جو کچھ دنیا کے عقب میں ہے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا اور گویا وہ اہل برزخ کے ان چھپے ہوئے حالات سے جو ان کے طویل

۱۔ سیری در نہج البلاغہ، ص۲۰۸
۲۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۴
۳۔ ایضاً، خطبہ ۱۰۸

عرصہ قیام میں پیش آیا ہے، آشنا ہو چکے ہیں اور گویا قیامت نے ان کے لئے اپنے وعدوں کو پورا کر دیا اور انھوں نے اہل دنیا کے سامنے ان چیزوں پر سے پردہ الٹ دیا یہاں تک کہ گویا وہ سب کچھ دیکھ رہے ہیں جسے دوسرے لوگ نہیں دیکھ سکتے اور وہ سب کچھ سن رہے ہیں جسے دوسرے نہیں سن سکتے[۱]۔

اگر وہ حقیقی زندگی کو اس دنیا میں نہیں بلکہ دوسری دنیا میں تلاش کرتے تو انھیں دنیا بے مقصد اور پوچ نہیں لگتی۔ ان لوگوں کی مثال "مثنوی معنوی" کے اس ہاتھی کی طرح ہے کہ لوگوں نے پہلے کبھی ہاتھی نہیں دیکھا تھا اور رات کی تاریکی میں ہاتھی کو چھو کر سب ہاتھی کے سلسلہ میں اپنی اپنی رائے دے رہے تھے حالانکہ واقعی ہاتھی ان کے نظریات سے بالکل مختلف تھا۔ وہ لوگ جو نظام تخلیق کے سلسلہ میں مایوسانہ نظریہ رکھتے ہیں یہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے وجود کی تاریکی میں عالم کا مشاہدہ کیا ہے اور اسی وجہ سے صحیح طور پر عالم کی حقیقت کو درک نہیں کر سکے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے خود کو شمع نور الٰہی سے محروم کر رکھا ہے جس کی روشنی میں عالم ہستی کے تمام زاویہ (دنیا و آخرت) قابل مشاہدہ ہیں اور اپنی کوتاہ فکر سے وہ تمام حقائق کو کشف کرنا چاہتے ہیں اور جب وہ اس کام میں ناکام ہو گئے تو انھوں نے دنیا پر بے مقصد، بے ہدف اور بے حکمت ہونے کی تہمت لگادی۔

بہ طور خلاصہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ انسان اور عالم ہستی کی شناخت و معرفت انسان کی باطنی شخصیت سے گہرا تعلق رکھتی ہے جو انسان کی ترقی و رشد یا اس کی تنزلی و سقوط کا سبب بن سکتی ہے؛ چونکہ انسان اپنی معرفت کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے۔ انسان کی ناقص و غلط معرفت رکھنا، انسانی کرامت کے مرتبہ تک پہنچنے میں اس کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے جو اس کی چھپی ہوئی صلاحیتوں اور توانائیوں کو کبھی بھی بارور نہیں ہونے دے گی۔ خود کی غلط تصویر کھینچنے کے سبب وہ ساری عمر ایسی شخصیت کو پروان چڑھانے میں گزار دے گا جو اس کے وجود سے بالکل بیگانہ و انجان ہے۔ اپنے حقیقی مقام و رتبہ کو نہ پہچاننے کے سبب ممکن ہے عالم ہستی میں دنیا اور اس کی لذتوں کو وہ اپنا نصب العین بنالے اسی طرح سے اگر انسان جہان ہستی کو مستقل حیثیت عطا کرے یا مایوسی و محرومی کی نگاہوں سے اسے دیکھے تو اس طرز فکر کی وجہ سے وہ ان

۱۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۱۱۹

سنہرے موقعوں سے غافل ہو جاتا ہے جو دنیا اسے عطا کرتی ہے تاکہ وہ انسانی کرامت کے عالی ترین مقام و رتبہ کو حاصل کرلے جس کے نتیجہ میں وہ قافلہ انسانیت سے بچھڑ جائے گا۔

منابع و مآخذ

- قرآن کریم
- نہج البلاغہ
- ابن ابی الحدید معتزلی، عبدالحمید، شرح نہج البلاغہ، انتشارات کتابخانہ مرعشی نجفی، قم، ۱۴۰۴
- ابن عربی، محی الدین، الفتوحات المکیہ، دار صادر، بیروت
- ابن منظور، مکرم، لسان العرب، دار الفکر، دار صادر بیروت، ۱۴۱۴ھ ق
- امام خمینی، سید روح اللہ، شرح چھل حدیث، مؤسسہ تنظیم و نشر آثار امام خمینیؒ، تہران، ۱۳۸۴
- امام خمینی، سید روح اللہ، شرح چھل حدیث، مؤسسہ تنظیم و نشر آثار امام خمینی، تہران، ۱۳۷۵
- تمیمی آمدی، عبدالواحد، غرر الحکم و درر الکلم، انتشارات دفتر تبلیغات اسلامی، قم، ۱۳۶۶
- توماس، ہنری و توماس دانالی، ماجراهای جاودان در فلسفہ، ترجمہ دکتر احمد شہسا، ققنوس، تہران، ۱۳۵۰
- جعفری، محمد تقی، ترجمہ و تفسیر نہج البلاغہ، دفتر نشر فرہنگ اسلامی، تہران، ۱۳۷۶
- جعفری، محمد تقی، فلسفہ و ہدف زندگی، مؤسسۂ تنظیم و نشر آثار علّامہ جعفری، تہران، ۱۳۸۵
- جوادی آملی، عبداللہ، امام خمینی و کرامت انسان، کرامت انسان (نشریہ همایش بین المللی امام خمینی و قلمرو دین (کرامت انسان))، شمارہ ۱، مؤسسہ تنظیم و نشر آثار امام خمینیؒ، تہران، ۱۳۸۶
- جوادی آملی، عبداللہ، تفسیر موضوعی قرآن، ج ۱۵، اسراء، ۱۳۸۴، قم
- جوادی آملی، عبداللہ، صورت و سیرت انسان در قرآن، اسراء، قم، ۱۳۹۰
- راسل، برتراند، مفهوم نسبیت انیشتین، امیر کبیر، تهران، ۱۳۴۳
- راغب اصفہانی، حسین بن محمد، المفردات فی غریب القرآن، دار العلم الدار الشامیہ، دمشق بیروت، ۱۴۱۲ھ ق
- رہنمائی، سید احمد، درآمدی بر فلسفہ تعلیم و تربیت، مؤسسہ آموزشی و پژوہشی امام خمینی، قم، ۱۳۸۸
- سعدی، مشرف بن مصلح، بوستان سعدی، تصحیح و حواشی استاد عبدالعظیم قریب و دکتر یحیٰی قریب، روزبہان، تہران، ۱۳۸۴
- شرفی، محمد رضا، جوان و بحران ہویت، سروش، تہران، ۱۳۸۹

- صدر الدین شیرازی، محمد بن ابراہیم، الحکمۃ المتعالیہ فی الاسفار الاربعۃ العقلیہ، ج ۳، دار احیاء التراث، بیروت، ۱۹۸۱
- طباطبائی، محمد حسین، المیزان فی تفسیر القرآن، انتشارات اسماعیلیان، قم، ۱۴۱۷
- علی ابن ابی طالبؑ، دیوان امام علیؑ، پیام اسلام، قم، ۱۳۶۹
- فروخ، عمر، عقائد فلسفی ابو العلاء فیلسوف معرہ، ترجمہ حسین خدیو جم، فیروزہ، تہران، ۱۳۸۱
- کاپلستون، فردریک، تاریخ فلسفہ، ترجمہ اسماعیل سعادت و منوچہر بزرگمہر، سروش، تہران، ۱۳۸۰
- کارل، الکسیس، انسان موجود ناشناختہ، ترجمہ پرویز دبیری، شرکت افست، تہران، ۱۳۴۵
- مجلسی، محمد باقر، بحار الانوار، مؤسسہ الوفاء، بیروت، ۱۴۰۴ھ ق
- مصطفوی، حسن، التحقیق فی کلمات القرآن، انتشارات وزارت ارشاد، تہران، ۱۴۱۶ھ ق
- مطہری، مرتضی، انسان کامل، صدرا، تہران، ۱۳۸۵
- مطہری، مرتضی، سیری در نہج البلاغہ، صدرا، تہران، ۱۳۸۴
- مولوی، جلال الدین محمد، مثنوی معنوی، نشر علم، ۱۳۸۳
- نصری، عبد اللہ، فلسفہ آفرینش، نشر معارف، قم، ۱۳۸۲
- ہاشمی خویی، میرزا حبیب اللہ، منہاج البراعہ فی شرح نہج البلاغہ، مکتبۃ الاسلامیہ، تہران، ۱۳۸۵